پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے کہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کر کے اطمینان کا سانس لوں اور جب اس کی کوششیں بار آور ثابت ہوتی ہیں تو وہ کہتی ہے شکر ہے خدا کا یہ بوجھ تھا میرے دماغ پر جو اتر گیا۔ لیکن عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ وہ مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتی کہ آپ کی ہر چال کو وہ سمجھتی ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے نوجوان یہ چالیں چل چکے ہوتے ہیں۔ آپ اسے ورغلا نہیں سکتے۔ فریب نہیں دے سکتے۔ منت سماجت سے بھی اپنا کام نہیں نکال سکتے۔ یوں بھی اس کا بدن ڈھیٹ ہو چکا ہوتا ہے اور وہ بے شک پوری شب بنا حجاب کے آپ کے ساتھ گزار دے لیکن آپ کو گزرنے نہیں دے گی۔ وہ اپنی گانٹھ کی پکی ہوتی ہے اور اسے کھولتی نہیں۔ جب تک کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو۔ اسے کھولنے کی۔ اور اس کے برعکس یہاں کی لڑکی۔ اگرچہ جانتی بہت کچھ ہے۔ اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا ہوتا ہے۔ دیکھ رکھا ہوتا ہے جو ''نیلا ہٹ'' کے زمرے میں آتا ہے لیکن وہ ان چھوئی ہوتی ہے۔ اور جب زندگی میں پہلی بار تنہائی میں چھوئی جاتی ہے تو وہ پگھل جاتی ہے بے بس ہو جاتی ہے۔ جدوجہد کرنا بھی چاہے تو اس کا بدن ساتھ نہیں دیتا۔ اسی لیے وہ ایک یورپی لڑکی کی نسبت کہیں زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔''

اور بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔

بات آئس کریم تک ہی محدود نہیں رہی تھی۔

دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ الگ سے دو چار رومانوی ملاقاتوں کے بعد جب اس نے ایک تنہائی میں اسے سرسری سا چھوا تو اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور وہ بے بس اور ڈھیلی ہو گئی۔ اتنی ڈھیلی کہ وہ اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اس میں تیرنے لگا۔

یہ کسی حد تک۔ بلکہ یقینی طور پر ایک بالجبر عمل تھا کہ اس میں دبلی پتلی لڑکی کی منشا شامل نہ تھی، محض اس کے بدن کی ان چھوئی زمین پر ایک مرد کا پہلا ہاتھ تھا۔

تجربے کی شرافت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی حاملہ نہیں ہوتا۔

وہ ہو گئی۔

کیونکہ دونوں کے پاس تجربے کی شرافت نہ تھی۔

سرگودھا کے کسی چک سے لاہور کے ایک ہوسٹل میں آئی ہوئی لڑکی ...جس کے والدین معمولی مزارع تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ان کی بیٹی چودھرانیوں کی فربہ رانیں ساری عمر دبانے کے بجائے پڑھ لکھ کر سکول ٹیچر ہو جائے۔ لیہ سے لاہور شہر میں آ جانے والی اپنی روم میٹ

کے جھانسے میں آ گئی کہ..تم چلو تو سہی..کچھ نہیں ہوتا..تھوڑی سی ڈرائیو اور پھر ایک آئس کریم یا برگر...جسٹ فار فن یار...اور لیہ سے آنے والی دو ماہ پیشتر لاہور کی ایک لڑکی...جس کے والدین انگلستان میں مقیم تھے...اس کے بھرّے میں آ گئی تھی کہ چلو کچھ نہیں ہوتا..اور واقعی پہلے کچھ بھی نہیں ہوا تھا..اور تب کچھ ہو گیا...

لیہ سے آنے والی لاہور والی سے گُر سیکھ چکی تھی' اس لیے اس کا پیٹ ہموار رہا...

اور دبلی پتلی کا پیٹ پھولنے لگا..

جب پہلی بار انکشاف ہوا تو وہ دونوں اتنے نروس ہوئے کہ رونے لگے..

ان کی ہچکیاں بندھ گئیں...

انہیں تو یاد بھی نہ تھا کہ تب کیا ہوا تھا اور کیسے ہو گیا تھا..

ناتجربہ کاری بھی کتنی بڑی لعنت ہوتی ہے..

اس ناتجربہ کاری کی بنا پر وہ بہت دن تک منتظر رہے کہ نہیں یہ نہیں ہو گا..کچھ نہ کچھ ایسا ہو گا کہ پیٹ پھولنے سے باز آ کر پھر سے ہموار ہو جائے گا..

ایسا کچھ بھی نہ ہوا..اور جب نہ ہوا تو ٹیمپل روڈ پر واقع ایک معروف کلینک کی کُل لاہور میں ان کاموں کے لیے شہرت رکھتی بوڑھی لیڈی ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا ''تم دونوں نے اگر جھک مارنی تھی تو پہلے دو چار ہفتوں میں کیوں نہیں آئے...اب چار ماہ کے بعد تو نارمل ابورشن نہیں ہو سکتی..سیزیرین کر کے نکالنا ہو گا..تو اتنی فیس ہو گی..''

اتنی فیس کے لیے اس کا موٹر سائیکل فروخت ہو گیا..

دبلی پتلی لڑکی جواب اتنی دبلی پتلی نہ رہی تھی' اس نے پتہ نہیں کیسے کیسے بہانے تراش کر سرگودھا کے چک سے جتنی رقم منگا سکتی تھی..منگائی..

تب جا کر ایک ایسی دوپہر آئی جب وہ دو گھنٹے کے بعد کلینک سے نکلی تو اس کا چہرہ ہلدی سے بھی زیادہ زرد اور پژمردہ تھا اور وہ چل نہیں سکتی تھی...

انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ ان کی ذات..الگ الگ تھی..وہ اس مجبوری کے تحت بھی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے..انہیں ایک دوسرے کے ساتھ عشق وغیرہ بھی نہ تھا..محض ناتجربہ کاری کے ہاتھوں مارے گئے تھے..

انہوں نے اس وقوعہ کے بعد بہت کم آپس میں ربط رکھا' ڈرتے تھے ایک دوسرے کی

آواز سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہماری آوازیں مل کر پھر وہی نتیجہ نہ برآمد کر دیں..

ایم بی اے مکمل کر کے وہ امریکہ چلا گیا.. سینٹ ویلنٹائن ڈے تھا جب اس نے.. بس اس کا جی چاہا.. اور اس نے اسے ایک کارڈ روانہ کر دیا ''کیا میں اب بھی تمہیں یاد آتا ہوں''

اور اس نے اپنے نام کے بغیر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ بھیجا تھا ''میرے پیٹ پر ایک ساڑھے پانچ انچ کا نشان تمہیں یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔''

اس کی شادی ایک ایسے زمیندار سے ہوگئی جو مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے پیٹوں کو جانتا تھا.. بہت دنوں اس نے روشنی میں اسے اپنا آپ دیکھنے نہ دیا اور ایک شب جب اس نے اس نشان کو محسوس کیا تو فوراً ٹیبل لیمپ آن کر کے ہاتھ کے نیچے آئی ہوئی پیٹ کی کھردری سطح کو دیکھا ''یہ کس کا تھا جسے تم نے ضائع کر دیا.. مجھے احمق سمجھتی ہو..''

شادی کے چند ہفتوں بعد اس نے اپنی مرضی سے یا خاوند کے کہنے پر خودکشی کر لی تھی..

اپنے ساڑھے پانچ انچ لمبے نشان کے ساتھ!

ہر شخص زندگی میں کوئی نہ کوئی جرم کرتا ہے..

یہ جرم جان بوجھ کر نہیں کیا جاتا.. بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے کہ جرم ہو گیا ہے.. تو وادیٔ شگر سے پار.. خوبانیوں کے بوجھ سے حاملہ درخت سے آگے.. ایک پرشور برفانی نالے کے دوسری جانب.. ڈاکیا چلا آتا ہے اور اس کے چرمی بیگ میں ایک ساڑھے پانچ انچ لمبے نشان کا بھی تو ایک خط اس کے نام ہو سکتا ہے جو اس نے خودکشی سے پہلے لکھا تھا...

میں نے ایک اور شدید حماقت کی ہے..

ایک حماقت تو میں نے ایک ایسا ناول شروع کر کے کی ہے جو ناول نہیں ہے اور دوسری حماقت یہ سرزد ہوئی ہے.. جب کہ جو کچھ ابھی تک لکھ چکا ہوں اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے.. مجھے اس دوسری حماقت کا احساس ہوا ہے..

یہ خیال ابھی ابھی میری کھڈی کے تانے بانے میں ایک کنکر کی مانند اٹک گیا ہے اور کھڈی کھٹ کھٹ نہیں اٹک اٹک کر کھٹک کھٹک چلتی ہے اور اٹکتی ہے.. میں نے پہلے سے ہی یہ قیاس کیوں کر لیا کہ وہ خط جو میرے نام کا آ سکتا ہے ایک لفافے میں ہی بند ہوگا.. ایک پوسٹ کارڈ کی صورت میں نہ ہوگا.. بس یہی حماقت ہوگئی ہے کہ میں ابھی تک اس خط کو ایک لفافے میں بند خیال کرتا رہا ہوں..

جب کہ یہ ایک پوسٹ کارڈ بھی ہو سکتا ہے..

اگر پوسٹ کارڈ ہو تو اس میں بہت سی آسانیاں ہو سکتی ہیں..

اسے پڑھے بغیر.. صرف دیکھ کر ہی انسان جان جاتا ہے کہ یہ زندگی کی نوید دیتا ہے یا کسی موت کی خبر.. اسے نزدیک کی عینک ناک پر جما کر پڑھنے کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی.. ایک ان پڑھ کے گھر میں بھی جب ایک پوسٹ کارڈ آتا ہے تو وہ اسے اپنی چوکھٹ سے اٹھاتے ہوئے یہ جان جاتا ہے کہ مجھ تک زندگی کے تسلسل اور سکھ چین کا سندیسہ آیا ہے یا آنے والے دن ماتم کے ہیں..

لیکن یہ تو گئے زمانوں کے.. گزر چکے زمانوں کی بات ہے.. شاید اب بھی کہیں کہیں دور افتادہ دیہات میں اُن زمانوں کے آخری سانس ہچکیاں لے رہے ہوں۔ جب ایک موت کی

اطلاع دور پار کے عزیزوں کو ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے ہی بھجوائی جاتی تھی.. ایسا پوسٹ کارڈ گاؤں کا ڈاکیا اسے ذاتی طور پر نہیں تھماتا تھا جس کے وہ نام آتا تھا بلکہ مکینوں کو اپنا چہرہ دکھائے بغیر صحن میں پھینک کر چلا جاتا تھا.. وہ جس کے نام یہ پوسٹ کارڈ آتا تھا وہ جھکتا تھا' اسے کچے فرش سے اٹھا کر پڑھے بغیر یہ جان جاتا تھا کہ یہ کسی موت کی خبر آئی ہے..

اور اس کچے صحن کے مکین جو حرف سے نا آشنائی رکھتے تھے.. ان پڑھ ہوا کرتے تھے وہ اس پوسٹ کارڈ کو فرش پر پڑا دیکھتے ہی بین کرنے لگتے تھے.. اسے پڑھے بغیر کہ وہ پڑھ نہیں سکتے تھے..

صرف دیکھتے تھے اور آہ وزاری ان کے کچے کوٹھے سے بلند ہو کر پورے گاؤں کے دروازوں پر موت کی دستک دینے لگتی تھی...

اس لیے کہ... پوسٹ کارڈ کا ایک کونہ پھٹا ہوا ہوتا تھا.. پھاڑ دیا جاتا تھا کہ یہی موت کا سندیسہ بھیجنے کا طریقہ تھا...

تو میں.. جو طے کر چکا تھا کہ کوئی سندیسہ صرف ایک لفافے میں ہی بند ہو سکتا ہے اپنے نام ایک پوسٹ کارڈ آنے پر.. اسے دیکھتے ہی یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ اس کے چاروں کونے موجود ہیں.. اگر ایک کونہ.. عام طور پر دائیں جانب والا کونہ اگر نا موجود ہے تو مجھے اسے پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی اور میں فی الفور جان جاتا کہ یہ خبر بری ہے..

یہ کتنی بڑی آسانی ہوتی..

ہاں.. اگر ایک کونہ پھٹا ہوا ہوتا تو میں اسے دیکھ کر قطعی طور پر آہ وزاری نہ کرتا.. بین نہ کرتا.. بھلا کوئی اپنی ہی موت کی خبر پر بین کر سکتا ہے.. آہ وزاری کر سکتا ہے..

لیکن میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ ڈاکیے کے پاس میرے نام کا کوئی سندیسہ ہے بھی یا نہیں..

اگر ہے تو ایک لفافے کی صورت میں ہے یا کسی پوسٹ کارڈ پر میرا نام درج ہے.. اور اسے بھیجنے والا کون ہے..

بس یہی حماقت مجھ سے ہو گئی کہ لفافہ یا پوسٹ کارڈ..

اب میں جان گیا ہوں کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے..

بس ہوا میں گرتی گئی..

ایک پر کٹے پرندے کی مانند گرتی گئی..

بس کے مسافروں کے چہرے جیسے حنوط ہو گئے..ٹھہر گئے انہی تاثرات میں منجمد ہو گئے جو شاہراہ پر ابھی پل دو پل پہلے ہنسنے سے..مسکرانے سے..بور ہونے سے یا اونگھنے سے ان کے چہروں پر آئے تھے..ان تاثرات کو..پھیلی ہوئی مسکراہٹ' جوانی کی جنسی خوشی اور بوریت کی لکیروں کو ابھی علم ہی نہیں ہوا تھا کہ ان پر پل دو پل میں زندگی یا موت کے دروازے کھلنے والے ہیں..ان کے چہرے رک گئے تھے' تاثرات کی روانی میں یکدم ٹھہر گئے تھے..

بس کے اندرون کی خاموشی بے یقینی میں تھی..

ان میں سے بیشتر یورپی اور امریکی سیاح تھے جو استنبول سے تہران جانے والی اس بس میں آ بیٹھے تھے اور جب بیٹھ رہے تھے تو ان کی سفر کی خوشی اور آنے والی اجنبی بستیوں کی منتظر چلبلاہٹ کو گمان بھی نہ تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ بس ایک سرخ ٹرک کو بچانے کے لیے باسفورس پر معلق پل کی ایک ریلنگ سے ٹکرائے گی اور ہوا میں گرتی جائے گی' ایک پر کٹے پرندے کی مانند گرتی جائے گی..

بس کے اندرون کی خاموشی کچھ دیر بے یقینی میں ٹھہری رہی اور پھر صدمے کی شدت سے یکدم شور و غوغا میں بدل گئی۔جتنی قومیتوں کے لوگ اس میں تہران جانے کی آس میں تھے' ان سب کی الگ الگ زبانوں میں جو آہ و بقا بلند ہوئی' اسے تو عام حالات میں بھی سمجھ جانا مشکل تھا چہ جائیکہ موت میں گرنے کے ایک لمحے میں ان کی کچھ تفہیم ہو جائے..

نیچے سمندر تھا..

وہاں آبنائے سسلی کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے یونانی دیومالائی سمندری جہازوں کو کم از کم یہ سہولت تھی کہ وہ شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے گرداب کے درمیان چناؤ کر سکتے تھے.. یہاں صرف گہرا نیلا سمندر نیچے تھا' جس میں گر جانا تھا..

ایک یقینی موت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے سامنے پا کر اس لمحے تمہیں خدا یاد آتا ہے' پھر اپنے پیاروں کے چہرے سامنے آنے لگتے ہیں.. لیکن ایسا ہوتا نہیں' کم از کم اس کے ساتھ تو نہیں ہوا.. کچھ بھی یاد نہیں آتا.. نہ خدا.. نہ اپنے پیارے.. انسان ایک سحر زدہ سناٹے میں چلا جاتا ہے اور اس پتھریلے بے جان سکوت میں انتظار کرتا ہے..

اس انتظار کا خاتمہ سمندر میں گرنے کے شڑاپ آبی شور سے نہیں ہوا بلکہ ایک ملفوف سی دھپ سے ہوا جیسے ایک سکائی سکریپر سے کودنے والے شخص کا وجود نیچے ساٹھویں منزل سے نیچے گر کر فٹ پاتھ پر دھپ سے گر کر فٹ پاتھ کے پتھروں کے درمیان خون بہانے لگتا ہے...

بس زمین پر گری تھی..

سمندر صرف چند میٹر کے فاصلے پر منتظر جھاگ اڑاتا تھا لیکن وہ سب ذرا دھر آ گرے تھے اور بھربھری مٹی کے ایک بند پر آ گرے تھے اور یوں بس اس مٹی میں دھنس کر ٹھہر گئی..

یہ نہیں کہ بس ایک ملفوف سی دھپ سے خاموشی سے گری تھی بلکہ زمین کے روکنے پر اس کے اندر ایک بھونچال آیا تھا اور سب کچھ اتھل پتھل ہو کر اپنے اپنے مقام سے ہٹ گیا تھا.. شکست وریخت کے عناصر بس کے اندرون میں اڑنے لگے تھے..

ان آخری لمحوں میں اگرچہ اس نے اگلی نشست کو اس آس میں مضبوطی سے اپنے سناٹے میں آئے ہوئے ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا' دانت سختی سے بھینچ لیے تھے کہ کریش کی اس شدت کو کسی نہ کسی طور سہہ جائے' لیکن جونہی بس کے ڈھانچے کے نیچے زمین کی دیوار آئی تو اس کی انگلیاں اگلی نشست کی پکڑ سے یوں الگ ہوئیں جیسے اس میں بجلی کا کرنٹ آ گیا ہو.. وہ اس جھٹکے کے بے مہار زور سے اپنی نشست پر سے ایک کھلونے کی مانند اوپر اٹھا' ذرا معلق ہوا اور پھر گر گیا.. اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے بدن کے کون کون سے حصے کہاں کہاں ٹکرائے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی ربط رہا بھی ہے یا نہیں..

یکدم آہ و بقا کی چیخ پکار تھم گئی.. سکوت اتر آیا جیسے ابھی حادثہ ہونے کو ہے اور پھر اذیت اور خوف کے در کھل گئے.. منہ کھل گئے اور ان میں سے حرف برآمد نہیں ہوتے تھے' محض ڈر اور

خوف کی گھگھیائی ہوئی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور ان سب کی زبان ایک تھی۔

ہر کوئی بس کے انجر پنجر ہو چکے ڈھانچے میں سے فی الفور نکل جانا چاہتا تھا' چاہے وہ کسی نشست میں پھنسا ہوا تھا' زخمی تھا یا مر چکا تھا' نکل جانا چاہتا تھا..

کسی کے تحت الشعور میں ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی ایک فلم چلتی تھی کہ ایسے حادثے کے فوراً بعد کار یا بس کو آگ لگ جاتی ہے اور اس میں سوار افراد بھسم ہو جاتے ہیں..

چند لمحوں کے مردہ اور بے یقین سناٹے کے بعد اس پر بھی انکشاف ہوا کہ اگر وہ بچ گیا ہے...زخمی نہیں ہے...ابھی مرا نہیں ہے تو ابھی یہ بس آگ کے ایک گولے میں بدل جائے گی اور وہ بھسم ہو جائے گا...

بس کا دروازہ حادثے کی شدت سے جکڑا جا چکا تھا اور سیاح مسخ شدہ کھڑکیوں اور کرچی کرچی ہو چکی ونڈ سکرین کے راستے باہر چھلانگیں لگا رہے تھے..اس کی نشست کے برابر میں جو کھڑکی تھی' بدقسمتی سے اس کا شیشہ سلامت رہا تھا..اسے اور کچھ نہ سوجھا اور اس کے ہاتھ میں اس کا اشائی پینٹکس کیمرہ آ گیا جو قدیمی ہونے کے باعث خاصا بھاری تھا..اور اسے اس نے ایک پتھر کے طور پر استعمال کیا اور کھڑکی کے شیشے پر مار کر اسے چور کر دیا..کھڑکی میں سے اپنے آپ کو باہر دھکیلتے ہوئے بچے کھچے شیشے کی نوکدار کرچیوں نے اس کے بدن سے خون آلود خراشوں کا خراج وصول کیا...اور وہ باہر اسی بھربھری مٹی پر جا گرا جس میں بس گری تھی..

وہ کچھ دیر تو وہیں ایک بوکھلائے ہوئے فاتر العقل شخص کی مانند گرا رہا.. ہانپتا رہا..خوف سے لرزتے بدن کی ہر رگ کے دھڑکنے کو محسوس کرتا رہا اور پھر اسے خیال آیا کہ اس کا سفری تھیلا' پاسپورٹ اور ٹریولر چیک تو وہیں رہ گئے تھے...وہ اگر ابھی مرا نہیں تھا تو ان کے بغیر بھی وہ زندوں سے بدتر ہو سکتا تھا..

اس نے اپنا سانس درست کیا..بس سے ذرا دور ہو کر اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تکتا رہا کہ یہ ابھی ایک دھماکے سے شعلوں میں بدل جائے گی اور جب وہ بے جان اور بے آگ رہی تو وہ اس کھڑکی کے راستے پھر سے اندر داخل ہوا جب کہ اس کے آس پاس' وہاٹ دے فکنگ ہیل آر یو ڈوئنگ..اوئے کیا کر رہے ہو..موت کے منہ میں جا رہے ہو..کی صدائیں بلند ہوتی تھیں..اس نے نشست پر سے اپنا سفری تھیلا اٹھایا اور پھر سے باہر کود گیا..

بھربھری مٹی کے بند پر بے سدھ پڑے..لیٹے ہوئے اور بمشکل بیٹھے ہوئے حادثے

کے صدمے میں جکڑے ہوئے سیاح کچھ بے حواس تھے اور کچھ اپنے زخم سہلا رہے تھے۔

وہ بھی ان میں سے ایک تھا۔۔

ایک جرمن سیاح نے۔۔اور جرمن بے حد تنظیم پسند ٹھنڈے اور کٹھور ہوتے ہیں۔۔اپنے بیگ میں سے سکاچ وہسکی کی بوتل نکالی اور کہنے لگا ''اگرچہ میں نے یہ سکاچ بُرے موسموں کے لیے سنبھال رکھی تھی، لیکن اس سے برے موسم اور کیا ہوں گے کہ تم سب جو ابھی مرنے لگے تھے یا کچھ مر بھی گئے ہیں تو تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔۔اپنے اپنے زخم ننگے کر دو کہ اس سے بہتر اینٹی سپٹک کوئی نہیں'' وہ بند بوتل اپنے دائیں کان کے قریب لایا اور اس کے ڈھکن کو گھماتے ہوئے جو ایک ٹوٹنے کی سرگوشی ہوئی، اس سے لطف اندوز ہو کر اس کے منہ سے منہ لگا کر ایک طویل شکرانے سے لبریز گھونٹ بھرا ''کون کون امیدوار ہے؟''

یوں مٹی پر لیٹے بیٹھے اوندھے پڑے۔۔ابھی تک صدمے میں، موت سے بچ نکلنے کی بے یقینی میں۔۔دوسرے سیاحوں کی پیروی میں۔۔اس نے بمشکل اپنی تنگ نیلی جین کے پائینچے چڑھا کر اپنے زخموں کو عیاں کیا۔۔دونوں ٹانگوں پر۔۔گھٹنوں سے نیچے پنڈلیوں پر زخم تھے۔۔کہیں خون تھا اور کہیں مردہ نیلاہٹ۔۔بقیہ بدن پر خراشیں اذیت کی لکیریں کھینچتی تھیں۔۔وہسکی کے چھینٹے پڑے تو وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔۔الکوحل تیزاب کی مانند زخموں اور خراشوں کو جیسے زندہ جلانے لگا۔۔

ایک امریکی لڑکی نے ایک اور سیاح خاتون کی مدد سے اپنا خون آلود بلاؤز کھولا تو اس کی چھاتیاں جیسے ذبح ہو چکی تھی۔۔کسی نے بھی اس کی مدھر چھاتیوں کو کو ان نظروں سے نہ دیکھا جو مردوں کی حریص نظریں ہوتی ہیں بلکہ ان میں شدید ہمدردی اور دوستی کا رچاؤ تھا۔۔جرمن نے ان پر وہسکی کا چھڑکاؤ کیا تو لڑکی تڑپنے لگی۔۔مٹی پر لوٹنے لگی۔۔

صرف ایک سیاح ایسا تھا جس کی جانب کوئی توجہ نہ کرتا تھا۔۔کیونکہ اسے کسی اینٹی سپٹک کی ضرورت نہ تھی۔۔وہ مر چکا تھا اور اس کی ساتھی لڑکی اپنے حواس کھو چکی تھی اور جرمن زبان میں جانے کس کو پکار رہی تھی۔۔

تھوڑی دیر بعد ایک ایمبولینس کے سائرن سنائی دینے لگے۔۔

پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔۔

اب جو ترک سپاہی آئے وہ اس امریکی لڑکی کی خون آلود چھاتیوں کو انہی نظروں سے دیکھ رہے تھے جو کہ مردوں کی ہوتی ہیں کیونکہ اس نے انہیں ڈھکا نہیں تھا۔۔

پولیس والوں کے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ زخمی مسافروں میں کوئی ترک نہ تھا..
اور یہ جو غیر ملکی تھے' اگر سمندر میں ڈوب جاتے یا سب کے سب مر جاتے تو بھی وہ سوگوار نہ ہوتے..اس شام تیز ترک وائن سے حسب معمول لطف اندوز ہوتے..وہ قطعی طور پر ہمدرد نہ تھے بلکہ اس پوری صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے..اور سیاح خواتین کے بارے میں ریمارکس کس رہے تھے..

کچھ لوگ بس کے ڈھانچے کو ایک کلہاڑے کی مدد سے کاٹنے کی کوشش میں تھے..

''کیا ہوا ہے؟''

''ڈرائیور کی نشست کے عین پیچھے جو اطالوی لڑکا بیٹھا ہوا تھا' اس کا بدن سٹیئرنگ میں پرویا گیا ہے اسے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں..وہ ابھی تک سانس لے رہا ہے..''

''کیا؟'' وہ حواس باختہ سا ہو گیا..

اسے فرانسسکو کا خیال ہی نہ رہا تھا..موت کے ڈر اور زخموں کی اذیت نے وہ پوری دوپہر فراموش کر دی تھی جو اس نے اس اطالوی کے ہمراہ شہزادوں کے جزیرے کی ایک ڈھلوان پر لیٹے ایک خمار آلود کیفیت میں نیچے نیلے سمندر میں تیرتے سفید بادبانوں کو دیکھنے میں گزاری تھی..

وہیں فرانسسکو نے اسے بتایا تھا کہ میرے والدین بے حد وہمی ہیں..شگونوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیتے تھے..بھلا مجھے کیا ہونا ہے..ہزاروں نوجوان سیاحت کے لیے گھر سے نکلتے ہیں..انہیں کیا ہوتا ہے..لیکن اسے..فرانسسکو کو وہ ہو گیا تھا اور سٹیئرنگ اس کی پسلیوں میں پرویا گیا تھا..

سفر کے آغاز میں وہ اپنی نشست..ڈرائیور کے عین پیچھے والی نشست سے کھڑا ہوا تھا اور اسے ہاتھ ہلا کر خوش دلی سے کہا تھا..یہ بس ذرا شہر سے نکل لے تو میں تمہارے پاس آ بیٹھوں گا..

اس ڈھلوان پر لیٹے جب وہ محویت سے سمندر میں تصویر ہوتی سفید بادبان والی ایک کشتی تکتا تھا تو اس نے پوچھا تھا کہ فرانسسکو کیا دیکھ رہے ہو؟..تو اس نے کہا تھا..''زندگی..زندگی کتنی خوبصورت ہے''اور اب وہ سٹیئرنگ کی پلاسٹک کی سلاخوں میں پرویا ہوا تڑپ رہا تھا..زندگی!

وہ اس ''زندگی'' کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا اور اس جانب دیکھنے سے گریزاں تھا' جہاں کچھ لوگ فرانسسکو کو سٹیئرنگ سے آزاد کرنے کی سعی کر رہے تھے..

مٹی کے بند کی ڈھلوان پر جو سیاح مردہ پڑا تھا..ڈھلوان کی وجہ سے لگتا تھا کہ وہ ابھی کھڑا ہو جائے گا..وہ اب تنہا تھا کیونکہ اس کی ساتھی لڑکی اس کی موت سے سمجھوتہ کر کے اس سے کچھ دور بیٹھی اپنے زخم سہلا رہی تھی..

اس نے دل کڑا کر کے..فرانسسکو کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر اٹھنے کی کوشش کی تو گر گیا..خراشیں اور زخم ٹھنڈے ہو رہے تھے..خون جم گیا تھا..بدن اکڑ گیا تھا اور اٹھنا ممکن نظر نہ آتا تھا..اس کے پاؤں جیسے جوگرز کی سلائیاں ادھیڑ کر تسمے توڑ کر باہر آنے کو تھے کہ وہ حادثے کی شدت سے خمیرے آٹے کی مانند سوج چکے تھے....اب اسے ترکی ایران اور افغانستان کی سرزمینوں پر تقریباً ننگے پاؤں چلنا تھا..انہیں کوڑھ کے مریضوں کی مانند پٹیوں میں لپیٹ کر چلنا تھا کہ ان کی سوجن کے باعث وہ کسی جوگر یا بوٹ میں سما نہیں سکتے تھے..

اور شام ہو رہی تھی..

اپنے گھر سے..وطن سے دور ایک اجنبی دیار میں..

اور یہ کوئی تسلی نہ تھی کہ اس دیار کے لوگ اس کے ہم مذہب ہیں..

تسلی صرف اپنی دھرتی کے سینے کے ساتھ لگ کر ہوتی ہے..بے شک اس دھرتی کا مذہب تمہارے مذہب سے جدا ہو..وہ ایک پاکستانی عیسائی بابا جی کو جانتا تھا جو امریکہ میں قیام پذیر تھے' لیکن انہوں نے وصیت کی کہ اگر میں مر جاؤں تو مجھے گوروں کے اس دیس میں نہیں اپنے پنجاب کے اس گاؤں میں دفن کیا جائے' جہاں میں پیدا ہوا تھا..اور ایسا ہی ہوا..

اور شام ہو چکی تھی..

ان کے اوپر باسفورس کے نئے پل پر سے گزرتی رینگتی بے شمار ٹریفک کی بے شمار لائٹس حرکت کر رہی تھیں اور وہ نہیں جانتی تھیں کہ نیچے ایک بھربھری مٹی کے بند پر ایک تباہ شدہ بس کے ڈھانچے کے آس پاس چالیس پچاس غیر ملکی سیاح کیسے اپنے اپنے وطن کو..اور ماؤں کو یاد کرتے بے آسرا اور زخموں سے بھرے پڑے ہیں..بے شک ان میں ان کا ایک ہم مذہب بھی کراہ رہا ہے..

سٹریچر اس کے قریب سے گزر گیا..

سٹریچر پر فرانسسکو کا خون آلود بدن بھاری ہو رہا تھا..اس کے بازو سٹریچر سے لٹکے ہوئے تھے..اور برابر میں اس کا اطالوی ہم سفر اسے پھٹی پھٹی نظروں سے تکتا اس سے باتیں کرتا

جاتا تھا جو..فرانسسکو تو نہیں سن رہا تھا کہ اس کا سینہ چاک تھا..

جونہی وہ سٹریچر اس سے دور ہوا تو اسے یاد آیا کہ اس فرانسسکو نے اپنا رُک سیک اس کے حوالے کیا تھا کہ آگے ڈرائیور کی نشست کے پیچھے اس کے لیے جگہ نہیں ہے..تم رکھ لو..تہران پہنچ کر تم سے وصول کر لوں گا..اور وہ رک سیک ابھی تک وہیں تھا..بس کے اندر!

اس نے اپنے اکڑے ہوئے بدن پر بوجھ ڈالتے ہوئے جھک کر جوگرز کے اب اذیت دیتے ہوئے تسموں کو کھولا..اپنے سُوجے ہوئے پاؤں کو آزاد کیا اور لڑکھڑاتا ہوا اٹھا..اب تک یہ تو طے ہو چکا تھا کہ بس کا تباہ شدہ ڈھانچہ آگ نہیں پکڑے گا..اس لیے دوبارہ اس کے اندر جانے میں کوئی قباحت نہ تھی..اس کے سُوجے ہوئے پاؤں اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہوتے تھے اور اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا اور بس کے اندر جا کر فرانسسکو کا رُک سیک اٹھا لایا..وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ رُک سیک اب کس کے حوالے کرنا چاہیے..زندگی!

پولیس نے انہیں بھیڑوں کی مانند دھکیل کر ایک ٹرک میں سوار کیا اور ایک عجیب ویرانی میں سے سفر کرتے..جہاں روشنیاں بہت کم تھیں..اندھیرے راستے تھے..کہیں شائبہ نہ ہوتا تھا کہ یہ مشرق کا روم استنبول ہے۔ایک نیم تاریک پولیس سٹیشن میں لے گئی..جہاں پر کارروائی ہونی تھی..حادثے کا شکار سیاحوں نے کچھ سرکاری کاغذات پر دستخط کرنے تھے..بیان دینے تھے..اگرچہ وہ دستخط کرنے یا بیان دینے کی حالت میں ہرگز نہ تھے..کہ وہ سب کے سب بے حد بھوکے پیاسے ہو چکے تھے اور زخمی تھے..وہاں اس ٹرک میں سے جب ان بھیڑوں کو نکال کر نیم تاریک پولیس سٹیشن میں انڈیل دیا گیا' تب معلوم ہوا کہ جس نے ان سے دستخط کروانے ہیں..بیان ریکارڈ کرنے ہیں' وہ پولیس افسر ابھی وہاں موجود نہ تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کے ختنے آج ہو رہے تھے اور وہ اس رسم سے فراغت کے بعد ہی ادھر آئے گا..

چنانچہ وہ سب..اس تھانے سے باہر کھلی جگہ پر آ کر ادھر ادھر بیٹھ گئے..

کچھ نڈھال ہو کر لیٹ گئے..اور کچھ رونے لگے..ہاں بلکتے ہوئے رونے لگے اور کچھ گانے لگے..

حادثے نے ان سب کو ایک برادری بنا دیا تھا..

عارضی طور پر رنگ' نسل' قومیت کا فرق مٹ گیا تھا..

سب ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے تھے..ڈھارس بندھاتے تھے..ٹھنڈے ہو چکے

زخموں کے اکڑاؤ کو سہتے پوچھتے تھے..آر یو آل رائٹ..تم ٹھیک ہو..زیادہ چوٹ تو نہیں آئی..
اگرچہ خود زخموں سے کراہتے تھے..

جنہیں بہت چوٹیں آئی تھیں..ابھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہڈیوں کی کیا کیفیت ہے..
شاید کچھ ٹوٹ چکی ہیں' وہ بھی اپنے زخموں سے بے نیاز پوچھتے تھے..آر یو آل رائٹ..کین آئی
ہیلپ یو..؟ اور پھر جس کے سفری تھیلے میں کھانے پینے کا جو بھی سامان تھا باہر آ گیا..

سوس ٹابلر چاکلیٹ کون کھائے گا..؟ کون کھائے گا..

چکن سینڈوچ..ڈبل روٹی..پنیر..دودھ اور بیئر کے ڈبے..وائن کی بوتلیں..اور ٹین بند
خوراکوں اور سوپوں کے ڈھیر..چولہے گرم ہو گئے..اور ایک اوپن ایئر پکنک شروع ہو گئی..کراہتے..
کبھی تاب نہ لا کر چلا اٹھتے..کبھی بے دم ہو کر گر بھی جاتے..سیاحوں کے لیے ایک پکنک کا اہتمام ہو
گیا..ہر ایک کی پوری اور پرخلوص کوشش تھی کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خود استعمال نہ کرے بلکہ
دوسروں کے کام آئے..

بازنطائن' قسطنطنیہ' کانسٹن ٹنوپل' استنبول' سات پہاڑیوں پر آباد دوسرا روم..کانسٹنٹائن
اور سلطان محمد کا شہر جہاں مسلمانوں نے عیسائیوں کے چاند کو اپنے لیے منتخب کر کے اسے اپنا نشان
بنا لیا..ڈھلوانوں پر شہر کی روشنیاں اترتی سمندر تک جاتی تھیں..

رات بیت رہی تھی..

پکنک کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا اور زخم ٹھنڈے ہو کر دراڑیں بنتے تھے اور ان کی
ٹیسیں برداشت سے باہر ہوتی تھیں..

لگتا تھا کہ اس کے پاؤں بھی سُوج سُوج کر اتنے بڑے اور بھاری ہو جائیں گے جیسے
ان کے ساتھ چکی کے پاٹ بندھے ہوں..

اور وہ اس پولیس افسر کے منتظر تھے جس نے ان کا بیان ریکارڈ کر کے انہیں آزاد
کرنا تھا..

اور وہ آہ ہی نہیں پا رہا تھا..

جن کے گھر قدرے قریب تھے..جرمنی' اطالیہ یا انگلستان میں تھے' وہ بقیہ سفر کا ارادہ
ترک کر کے اپنے اپنے وطن یہیں سے لوٹ جانے کا سوچ رہے تھے..انہوں نے خواہش کے تمام
دریاؤں' صحراؤں اور پہاڑوں کو ترک کر دیا تھا..وہ اپنے گھروں کی عافیت میں پہنچ کر دبک جانا

چاہتے تھے..لیکن اس سفر کو جاری رکھنا چاہے ہر روز ایک حادثہ ہو جائے اس کی مجبوری تھی کہ اس کا گھر کہیں آس پاس نہ تھا بہت دور تھا..سُوجے ہوئے پاؤں کے ساتھ بے شک پیدل چل کر اسے تو اپنے گھر پہنچنا تھا..

البتہ امریکی سیاح تذبذب میں تھے'ان کا گھر اس کے گھر سے بھی کہیں دور رہ گیا تھا..

ایک امریکی سیاح جس کے بال شانوں پر آتے تھے اور اس نے ناک میں سونے کا ایک چھلا جھلایا ہوا تھا' اس تاریک اور مرگ آور ماحول میں بھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا..مسلسل باتیں کرتا جا رہا تھا..ہے گائز ہم کسی تدفین پر تو اکٹھے نہیں ہوئے تو اتنے سنجیدہ چہرے کیوں..تمہیں تو پر مسرت ہو کر یا ہو یا ہو کے نعرے لگانے چاہئیں کہ تم اور ہم سب زندہ بچ گئے ہیں..ہم زندہ ہیں ڈیم اِٹ..سانس لیتے ہیں..مردہ نہیں ہیں تو اتنی سوگواری کیوں..

کسی نے اسے فرانسسکو کے بارے میں بتایا..اس جرمن کے بارے میں بتایا جس کی لاش کسی ہسپتال کے مردہ خانے میں پڑی تھی..

''تو پھر کیا ہوا..اگر وہ مر گئے ہیں..تو وہ مر گئے ہیں..ہم تو نہیں مرے..چلو اس زندگی کے انعام کا جشن مناتے ہیں..'' اس نے اپنی گٹار کو کیس میں سے باہر نکالا اور اس کی تاروں کو چھیڑنے لگا..کنٹری میوزک کی کوئی دُھن بجانے لگا اور گانے لگا..

سبھی چپ رہے..کچھ نہ بولے..سنتے رہے..

وہ اپنی گٹار پر جھکا گانے میں مگن رہا..اور پھر یکدم اپنی جین کے درمیان میں ہاتھ مار کر بولا..'' ہے..میں پچھلے چھ گھنٹوں سے ہر شے روکے ہوئے ہوں..ٹائلٹ نہیں گیا اور دیٹس اے ریکارڈ..میں ذرا اپنے آپ کو ہلکا کر آؤں..کوئی میرے ساتھ آئے گا..؟نہیں؟ تو پھر مجھے معاف کیجیے گا..''

وہ اس گروہ سے الگ ہو کر تاریکی میں چلا گیا..واپس آیا تو ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا..

وہ بہت دیر تک خود ہی ہنستا رہا اور کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ اس طرح کیوں ہنسے جا رہے ہو..ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو تادیر چپ رہنے کے بعد یکدم قہقہے لگانے لگتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے'تو یہ صورت حال انوکھی نہ تھی..اس لیے اس سے کسی نے کچھ نہ پوچھا..

''ہے گائز..سنو..میرے پاس ایک خبر ہے..'' اس نے سب کو متوجہ کیا..''میں ابھی اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے لیے ادھر تاریکی میں گیا..ذرا دور گیا تو پتہ ہے میں نے وہاں کیا دیکھا..تم

سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے کیا دیکھا.. بھلا میں نے کیا دیکھا.'' وہ چپ ہو گیا کہ شاید کوئی تو پوچھے گا کہ کیا دیکھا لیکن جب کسی نے نہ پوچھا تو اسی عالم سرخوشی میں ہنستا ہوا بولا'' وہاں اس تاریکی سے پرے ایک بہت بڑا اور قدیم ترک قبرستان ہے.. ہزاروں قبریں ہیں اور سب کی سب بلڈی ٹرکس کی.. اور تم ایک قبر کو دور سے دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ یہ ایک مرد کی ہے یا عورت کی.. مردوں کی قبروں پر پتھر کی پگڑیاں ہیں اور عورتوں کے سرہانے پتھریلے پھول ہیں.. میرا خیال ہے یہ ایک زبردست اور انوکھی رسم ہے.. ہمیں بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے امریکہ میں.. وہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس قبر میں کون ہے.. ہم تو ترکوں کی مانند پگڑیاں نہیں پہنتے تو ہم ان پر ہیٹ ہی سجا سکتے ہیں اور عورتوں کی قبروں کے لیے.. یہی پھول مناسب رہیں گے.. کیا خیال ہے..؟''

کسی نے کچھ نہ کہا..

''لیکن سرپرائز تو ابھی باقی ہے.. میں نے جب اس قبرستان کو دیکھا تو سوچا کہ اگر آج ہم سب مر جاتے تو یہی قبرستان ہم جیسے غیر ملکیوں سے لبریز ہو جاتا.. ڈیٹ گریو یارڈ وڈ ہیو بین فُل آف بلڈی فارنرز.. ذرا سوچو کہ یہ کتنی مزاحیہ بات ہوتی کہ اس میں دفن ترک اتنے غیر ملکیوں اور غیر مذہب کے لوگوں کی آمد سے کتنے بے آرام ہوتے..''

واقعی وہ قبرستان بلڈی فارنرز سے فُل ہو جاتا.. لیکن کم از کم ایک فارنر کی آمد سے.. کہ وہ بھی ان کا ہم مذہب تھا.. وہ بے آرام نہ ہوتے..

''گائز..'' امریکی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا.'' ذرا سوچو ہم وہاں اس لمحے دفن ہو رہے ہوتے.. اگر نہیں ہوئے تو ہم خوش نصیب ہیں تو اتنی سوگواری کیوں؟''

بہت غور سے دیکھنے پر.. پولیس سٹیشن کے باہر اس ویرانے میں جہاں وہ بیٹھے تھے' اس سے پرے تاریکی میں قبروں کے شائبے استنبول کی اس بے مہر رات میں دکھائی پڑتے تھے... امریکی درست کہہ رہا تھا.. جائے حادثہ سے قریب ترین یہی قبرستان تھا.. اور اگر وہ لاوارث لاشیں ہوتے جو کہ وہ ہو جاتے کہ یہاں کون ان کا وارث تھا تو اسی قبرستان میں انہیں جگہ ملتی.. اور کسی کو ملتی یا نہ ملتی۔ کم از کم اسے مل جاتی کہ وہ پورے گروپ میں واحد اسلامی بھائی تھا.. بقیہ حضرات اپنے اپنے عقیدے کے قبرستان میں جا کر آرام کرتے.. استنبول میں عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے بھی مناسب بندوبست تھا..

''ہے گائز..'' وہ امریکی باز نہیں آتا تھا.. بولتا چلا جاتا تھا'' کم آن... ووئی آر ناٹ

ڈیڈ..ووئی آر الائیو اینڈ کِکنگ..اور اگر تم موت کا کوئی گیت ہی سننا چاہتے ہو تو وہ بھی میں سنا سکتا ہوں..میں تم کو ٹام ڈولی کی پھانسی کا گیت سنا دیتا ہوں..''

''ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی..ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ اینڈ کرائی..

کاز ٹو مارو یو آر گوئنگ ٹو ڈائی..''

ٹام ڈولی اپنا سر جھکا لو..اور سر جھکا کر رونے لگو..کہ کل سویرے تمہیں پھانسی پر چڑھ جانا ہے..

اگر چہ یہ امریکی کنٹری میوزک کا ایک بہت ہی المناک گیت تھا' لیکن وہ امریکی اسے جھوم جھوم کر..خوش ہوتے..مسکراتے ہوئے گائے چلا جا رہا تھا..

کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور پھر وہ امریکی لڑکی جس کی چھاتیاں زخموں سے چھلنی تھیں اور وہ ان کی اذیت میں مبتلا دوہری ہوتی جاتی تھی' سر اٹھا کر ایک رندھی ہوئی آواز میں اس کا ساتھ دینے لگی..ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی..آہستہ آہستہ جیسے خوابیدہ لوگ بیدار ہوتے ہیں..بقیہ سیاح بھی..جو انگریزی جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے وہ بھی ان دونوں کی آواز میں آواز ملانے لگے..

ٹام ڈُولی..ٹام ڈُولی..تم نے کل صبح پھانسی پر جھول جانا ہے..

یہ ٹام ڈولی کسی اور ثقافت کی نمائندگی کرتا تھا..وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کیوں پھانسی لگایا گیا اور اس کے بارے میں یہ لوک گیت کیوں لکھا گیا لیکن اس کے باوجود وہ بھی ان میں شامل ہو کر ٹام ڈولی ٹام ڈولی الاپنے لگا..

موت کے اس گیت نے حیرت انگیز طور پر سب لوگوں کو حادثے کے صدمے سے نکال کر نارمل کر دیا..وہ جرمن سیاح جس نے وہسکی کی ایک بوتل بُرے وقتوں کے لیے سنبھال رکھی تھی اور اسے بے دریغ ان کے زخموں پر چھڑک رہا تھا' اٹھا اور اسی بوتل کو منہ لگا کر ایک طویل طمانیت کا گھونٹ بھر کر کہنے لگا..''ابھی اس میں کچھ سکاچ باقی ہے اور یہ صرف بدن کے ہی نہیں روح کے زخموں کو بھی مندمل کرتی ہے..اور آپ سب اس میں سے اپنا اپنا حصہ لے سکتے ہیں..کون امیدوار ہے..؟''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک عجیب سوگوار مے خانہ کھل گیا...

تقریباً ہر ایک کے پاس..اُس کے سوا..برے وقتوں کے لیے کچھ نہ کچھ موجود تھا..اور

اس سے بُرے وقت اور کیا ہو سکتے تھے..

اس سوگوار مے خانے میں جتنے بھی شرابی تھے' ان کے لیے محض ایک ایک گھونٹ ہی کافی تھا. نشہ شراب کی مقدار پر نہیں موقوف..

فرانسسکو کے بارے میں بھی اطلاع آ چکی تھی کہ اس کی حیات منقطع ہونے سے بچ گئی ہے..

رات آدھی ہوگئی..

لیکن اب کسے پروا تھی.. زخم بھول گئے تھے.. وہ اپنے سُوجے ہوئے پاؤں اور خون آلود خراشیں فراموش کر چکا تھا.. نہ وہ اس مردہ جرمن کے بارے میں سوگوار تھے کہ یہاں ایک نامانوس پولیس سٹیشن کے باہر تاریک ویرانے میں.. جانے کون سے مقام پر.. استنبول میں.. ایک قدیمی قبرستان کے کنارے چالیس کے لگ بھگ غیر ملکی تھے.. اپنے گھروں سے کہیں دور اور گلے پھاڑ پھاڑ کر گائے چلے جا رہے تھے" ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی.. ٹام ڈولی.. ٹام.. ڈولی.."

ڈبل روٹی اور پنیر کھا رہے تھے.. چاکلیٹ ہڑپ کر رہے تھے اور خود فراموشی کی منزلوں پر تھے.. جب پولیس سٹیشن کی جانب سے ایک باوردی ترک نمودار ہوا.. یہ وہی پولیس افسر تھا جس نے ان کے بیان لینے تھے.. اس نے شدید حیرت میں اپنے سامنے غیر ملکیوں کے اس گروہ کو غل غپاڑہ کرتے دیکھا اور یقین نہ کر سکا کہ ابھی اسی شام یہی لوگ تھے جن کی بس فضا میں اڑتی باسفورس کے کناروں پر جا کر ریش ہوئی تھی.. یہ سب زخمی اور لاچار ہیں.. ان کا ایک ساتھی مر چکا ہے.. ایک اور ساتھی ہسپتال میں ٹوٹی ہوئی پسلیوں کے ساتھ بے ہوش پڑا ہے اور پھر بھی یہ کوئی جشن منا رہے ہیں.. ان میں سے ایک جو گٹار بجا رہا تھا' قہقہے لگاتا اس کے قریب آیا اور منہ پھاڑ کر کہنے لگا" ہیلو.. ٹام ڈولی.."

پرے ایک قدیم قبرستان پھیلا ہوا تھا.. اور اگر اس میں کوئی جگہ باقی تھی تو وہ اس لمحے بلڈی فارنرز کی لاشوں سے پُر ہوتا..

وہاں زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا بھی تھا جو اس کے حصے میں آ سکتا تھا..

اس کی قبر بن سکتا تھا.. اور نہ بنا..

یہ خط اس خالی زمین کا بھی ہو سکتا تھا کہ میں تمہاری منتظر رہی تم کیوں مجھ میں دفن نہ

ہوئے..تمہارے سُوجے ہوئے پاؤں کے لیے مجھ میں بہت گنجائش ہوتی..

ہوسکتا ہے وہ قبر..استنبول کے اس قدیمی قبرستان میں ایک مدت تک اس کے انتظار میں رہی اور اب جا کر وہ بے صبر ہوئی اور اس نے یہ خط لکھا ہو کہ آ جاؤ..میں اب بھی تمہارے انتظار میں خالی پڑی ہوں..

اس قبر کا خط اگر ہے تو یقیناً ترکی زبان میں ہوگا..اور من ترکی نمی دانم!

گاؤں کی سردیوں کی ایک اور رات ہے..

جولاہوں کا کچا صحن.. برنے کا پیڑ اور اس سے ملحقہ مسجد کے مینار وہی ہیں..

فرش پر چوکڑیاں مار کر بیٹھے ہوئے جولاہے.. میراثی.. ترکھان.. لوہار.. جاٹ.. وغیرہ بھی وہی ہیں..

لیکن.. یہ رات اور ہے..

آج رات برنے کے پیڑ سے بندھے رسّے کے ساتھ نورا ماچھی یا دینا تیلی نہیں جھول رہا بلکہ وہ جولاہا حال کھیل رہا ہے جو اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ایک ایسا کھیس بننے کی سعی کر رہا تھا' جس کے سارے دھاگے الجھے ہوئے ہیں..

آج وہ جھول رہا ہے..

یہ نہیں کہ وہ اپنی کھڈی کو چھوڑ کر ادھر آ جھولا ہے.. نہیں' کھیس کی بُنت بھی جاری ہے اور رسّے سے الٹا لٹکے جھولنا بھی جاری ہے..

اس کے بدن کو اب کوئی بھی نہیں جُھلا رہا' اس میں بھی دس بیلوں کا زور آ چکا ہے اور اس کی ناک برنے کے پتوں کو چھوتی آسمان کو اپنے بدن میں اتارتی ہے..

فرش پر چوکڑیاں مار کر بیٹھے کمبلوں اور کھیسوں کی بکلوں میں سے صرف جن کے سر دکھائی دیتے ہیں' وہ سارے لوگ اور وہ ایک بچہ بھی چوری چھپے یہاں آیا ہے.. یہ سب کے سب اسے فراموش کر چکے ہیں.. جسے انہوں نے رسّے سے باندھا تھا اور قوالوں کے سُروں کے ساتھ سُر ہلاتے ہیں.. پوہ ماگ کی اس ایک سرد رات میں بھول چکے ہیں کہ ان پر سایہ فگن ایک برنے کا شجر ہے جس کی ڈال سے بندھے رسّے کے ساتھ وہ جولاہا اپنے زور میں جھومتا چلا جا رہا ہے..

البتہ بہت سوں کے ذہن میں ایک سوال کلبلاتا ہے کہ نُورے ماچھی یا دینے تیلی کو رسّے سے باندھنا تو ہمیں یاد پڑتا ہے' اس جولاہے کو ہم نے کب باندھا تھا.. یہ کچھ یاد نہیں آ رہا.. یا ہم قوالی میں غافل تھے اور اسے کوئی اور باندھ گیا.. ہم نے ہی اس کے پاؤں کو باندھا ہوگا' اس کی تڑپ کے آزار کو کم کرنے کے لیے اور ہمیں یاد نہیں آ رہا ورنہ یہ اپنے آپ کو تو الٹا نہیں باندھ سکتا..

چنانچہ اب دو فریق ہیں..

ایک زمین پر.. کچے فرش میں سرایت کرتی ہوئی یخ کو اپنی پیٹھ کی کاٹھی پر محسوس کرتے' پہلو بدلتے.. قوالوں کے شعروں کو نہ سمجھتے ہوئے بھی.. جھومتے.. مارا بہ غمزہ کشت و قضارا بہانہ ساز.. دعارا بہانہ ساز.. بہانہ ساز... نہ سمجھتے ہوئے بھی.. جھومتے..

اور دوسرا فریق ان کے سروں کے عین اوپر برنے کی ڈال سے بندھے رسّے کے ساتھ ہلارے لیتا.. موج کرتا..

اور دونوں ایک دوسرے کی غفلت کے مارے ہوئے..

وہ.. قضارا بہانہ ساز میں مست.. اور وہ اپنے 'ہلارے' میں گم..

جولاہا ایک گُجری.. ایک تنے بدن کی لشکتی جِلد والی.. جیسی جِلد ایک بدخشانی گھوڑے کی ہوتی ہے ویسی جِلد کی گُجری کی طرح اپنی وحشت اور جنسی بے اختیاری میں خود ہی زور لگاتا.. اپنی دیوانگی کی سرمستی میں خود ہی ٹانگیں سمیٹ کر.. اپنے سر سے اپنے ہی پاؤں کو جا چھوتا برنے کی بلندیاں تک چلا جا رہا تھا.. پھر واپس آ رہا تھا اور پھر ٹانگیں سمیٹ کر اپنے آپ زور لگاتا اوپر شاخوں تک جا پہنچتا تھا..

جولاہے کو خود بھی یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس رسّے کے ساتھ اس کے پاؤں کس نے باندھے تھے..

اگرچہ اس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کھڈی کے پیڈل کو دباتے تھے.. تانا بیٹا کھلتا تھا اور اس میں سے نال گزرتی تھی.. کھٹ کی آواز اور کھیس کی بُنت میں ایک اور دھاگے کی بُنت کا اضافہ ہو جاتا تھا..

اگر اس لمحے کوئی اس کی اندھیری کچی کوٹھڑی میں جھانکتا تو وہ وہاں تھا..

اور جو اس سے غافل ہو چکے تھے ان میں سے کوئی نظر اٹھا کر اوپر برنے کو دیکھتا تو وہ وہاں بھی تھا..